اصلاح فی الارض کا قرآنی تصور

محمد عمر اسلم اصلاحی

اللہ تعالیٰ خالق ہے اور پوری کائنات اس کی مخلوق ۔ ان تمام مخلوقات میں فرشتوں کو اس لحاظ سے امتیاز حاصل ہے کہ وہ نطق و گویائی ،فہم وفراست ، بہت زیادہ طاقت وقوت، کائنات کے گوشے گوشے تک رسائی اور منٹوں ، سکنڈوں میں دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک آنے جانے کی بے پناہ صلاحیت رکھنے کے باوجود کبروغرور سے بالکل پاک ، اللہ کے فرماں بردار، محاسن سے مالا مال اور رزائل سے یکسر مجتنب ہیں ۔ اوصاف وکمالات میں دنیا کی کوئی مخلوق ان کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کرسکتی ۔

لیکن انسان کو دوسری تمام مخلوقات پر تفوق اس پہلو سے حاصل ہے کہ وہ مسجودِ ملائک ہے۔ شمس وقمر، شجر وحجر، آتش و باد، آب وہوا، نباتات و جمادات سب اس کے خادم اور اس کے لیے مسخر ہیں اور اس کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ وہ زمین میں اللہ کا خلیفہ ہے۔ خلافت منصب بھی ہے اور ذمہ داری بھی۔ منصب کا تقاضا ہے کہ انسان اسے داغدار نہ کرے اور ذمہ داری کا تقاضا ہے کہ وہ اس کا پورا پورا پاس ولحاظ رکھے۔

خلیفہ مختار کل اور حکمران مطلق نہیں ہوتا بلکہ وہ جس کا خلیفہ ہوتا ہے اس کے امر و نہی کا پابند ہوتا ہے، البتہ اسے رعایا پر حکمرانی کے بہت سارے اختیارات حاصل ہوتے ہیں۔ یہ خلیفہ ہر چند کہ پابند ہوتا ہے مالکِ حقیقی کے احکام کا لیکن خلیفہ ہونے سے اسے جو اختیارات حاصل ہوتے ہیں ان کا وہ صحیح استعمال بھی کرسکتا ہے اور غلط استعمال بھی۔ البتہ اختیارات کے غلط استعمال پر وہ جواب دہی سے بچ نہیں سکتا۔ چوں کہ انسان اللہ کا خلیفہ ہے اس لیے وہ پابند ہے اللہ کے احکام کا، اس کے اوامر ومنہیات کا۔ اللہ کے احکام کا پابند

ہونا، اس کے اوامر پر عمل کرنا اور اس کے منہیات سے اجتناب کرنا ہی دراصل اصلاح فی الارض ہے۔ اور اللہ کے احکام کو نظر انداز کرنا، اس کی ہدایات کا پاس ولحاظ نہ رکھنا، من مانی کرنا اور اللہ کے بندوں کو اپنی غلامی میں لینا ہی افساد فی الارض ہے۔

اصلاح فی الارض اور افساد فی الارض کا قرآنی تصور پیش کرنے کی ایک صورت تو یہ ہے کہ دونوں کو ایک دوسرے کے مقابل رکھ کر پیش کیا جائے۔ بعض حالات میں یہ مفید بھی ہے لیکن دوسری صورت یہ ہے کہ اصلاح فی الارض اور افساد فی الارض کا تصورِ قرآنی الگ الگ بیان کیا جائے۔ اس سے فائدہ یہ ہوگا کہ اصلاح فی الارض کی صورتیں اختیار کرنے اور افساد فی لارض کی راہیں مسدود کرنے کا الگ الگ تصور سامنے آجائے گا۔ اصلاح کرنے والے تصورِ اصلاح سے فائدہ اٹھائیں گے۔ اور افساد فی الارض سے بچنے کی خواہش رکھنے والے افساد کی صورتوں سے واقفیت کی وجہ سے آسانی سے بچ سکیں گے۔ پیش نظر مقالہ کے مباحث اصلاح فی الارض میں محدود رہیں گے۔

قرآن مجید کتابِ ہدایت ہے اس لیے ہمیں زندگی کے تمام شعبوں میں اسی سے ہدایت ورہنمائی حاصل کرنی چاہیے۔ اس کتاب میں اللہ تعالی نے ہدایت کے تمام پہلوؤں کو کھول کھول کر بیان کردیا ہے، پس جو لوگ اس سے رہنمائی حاصل نہیں کرتے وہ اللہ اور اس کے بندوں کی لعنت کے مستحق قرار پاتے ہیں لیکن جو لوگ احساس پیدا ہوجانے کے بعد اس سے رہنمائی حاصل کرتے ہوئے اپنی سابقہ زندگی تبدیل کرلیتے ہیں وہ قرآن کے بیان کے مطابق مصلح ہیں جیسا کہ ارشاد ربانی ہے:

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنٰتِ وَالْهُدَى مِن بَعْدِ مَا بَيَّنّٰهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ أُولَٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَيَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُونَ إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا وَأَصْلَحُوا وَبَيَّنُوا فَأُولَٰئِكَ	بے شک جو لوگ ان کھلی کھلی نشانیوں اور ہدایت کو چھپاتے ہیں جن کو ہم نے نازل کیا بعد اس کے کہ ہم نے ان کو کتاب میں کھول کھول کر بیان کردیا ہے تو وہی لوگ ہیں جن پر اللہ لعنت کرتا ہے اور لعنت کرنے والے لعنت کریں گے، البتہ جن لوگوں نے توبہ کرلی اور اپنا رویہ درست کرلیا

أَتُوبُ عَلَيْهِمْ وَأَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيمُ (البقرة:۲/۱۵۹-۱۶۰)

اور (اب تک جن چیزوں کو چھپاتے رہے انھیں) کھول کھول کر بیان کردیا تو یہی لوگ جن کی توبہ میں قبول کرتا ہوں اور میں بڑا توبہ قبول کرنے والا، رحم کرنے والا ہوں۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اپنے حقوق کے ساتھ حقوق العباد کا بھی ذکر کیا ہے اور حقوق العباد کی ادائیگی کے بغیر کوئی بھی سماج امن وسکون کا گہوارہ نہیں بن سکتا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے حقوق کے بعد بندوں کے حقوق کا بھی ذکر کیا ہے۔ اس نے اپنے جن بندوں کے حقوق کا خصوصی اہمیت کے ساتھ ذکر کیا ہے ان میں یتیم بھی ہیں۔ یتیموں کے حقوق کی ادائیگی بہت آسان نہیں ہے، اس میں چند در چند پیچیدگیاں ہیں، مثلاً اگر ان یتیموں کی مائیں جواں سال ہیں جن کے تعاون کے بغیر یتیموں کے حقوق کی ادائیگی اگر ناممکن نہیں تو مشکل ترین امر ضرور ہے، تو اس میں بڑی پیچیدگی ہے۔ اسی طرح بعض یتیم بڑے سرمایہ دار بھی ہوسکتے ہیں لیکن عمر کی جس منزل میں ہیں انھیں اپنی دیکھ ریکھ، تربیت اور سرمایہ کے تحفظ کے لیے مضبوط ہاتھوں کی ضرورت ہے۔ مضبوط ہاتھوں والے سرمایہ دار بھی ہوسکتے ہیں اور معاشی لحاظ سے کمزور بھی، اب اگر معاشی لحاظ سے کمزور سرپرست یتیموں کے لیے سہارا بنیں، ان کی دیکھ ریکھ اور تربیت کریں اور ان کے سرمایہ کے تحفظ کی ذمہ داری سنبھالیں تو بہت ممکن ہے کہ اپنی اور اپنے اہل وعیال کی ضروریات زندگی کی تکمیل نہ کرسکیں۔ یہ اور اس طرح کی اور بھی کئی پیچیدگیاں ہیں، لیکن ان پیچیدگیوں کی وجہ سے یتیموں کو بے سہارا چھوڑ دینے کی اجازت نہیں ہے بلکہ فتنوں سے حتی الامکان بچتے ہوئے ان کی نگرانی اور کفالت کی ذمہ داریوں کو سنبھالنا ضروری ہے۔ یہ بھی اصلاح فی الارض ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن نے یہ رہنمائی فراہم کی ہے:

وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْيَتَامَىٰ قُلْ إِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ وَإِنْ تُخَالِطُوهُمْ فَإِخْوَانُكُمْ وَاللَّهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ وَلَوْ

اور وہ تم سے یتیموں کے متعلق سوال کرتے ہیں، کہہ دو جس صورت میں ان کی بھلائی ہو وہی بہتر ہے، اور اگر تم ان کو اپنے ساتھ ملالو تو وہ تو تمہارے بھائی ہی ہیں، اور اللہ

شَاءَ اللّٰهُ لَأَعْنَتَكُمْ إِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ (البقرۃ:۲/۲۲۰)

برائی چاہنے والے کو بھی جانتا ہے اور بھلائی چاہنے والے کو بھی اور اگر اللہ چاہتا تو تمہیں مشقت میں ڈال دیتا، بے شک اللہ غلبہ والا، حکمت والا ہے۔

اسی وجہ سے یتیموں کی کفالت کی راہ میں دشواری کے پیش نظر ان کی ماؤں سے شادی کر لینے کی اجازت دے دی گئی ہے، لیکن تین شرطوں کے ساتھ: (۱) ان سے شادی کر لینے سے اپنے بسے بسائے گھروں کے اجڑنے کا اندیشہ نہ ہو۔ (۲) ان کے مہر بھی اسی طرح ادا کیے جائیں جس طرح دوسری بیویوں کے ادا کیے گئے ہیں۔ (۳) ان کے ساتھ سلوک میں جانب داری نہ برتی جائے۔ یتیموں کی کفالت ایک الگ فریضہ ہے اور بیویوں کے حقوق کی تکمیل ایک الگ فریضہ ہے، اس لیے دونوں حکموں کو فریضہ کی حیثیت سے لینا چاہیے۔ یہ ہدایت تو یتیموں کی کفالت کرنے والے مردوں کو ہے لیکن یتیموں کی ان ماؤں کے لیے جن سے یتیموں کے کفیل نے نکاح کر لیا ہے یہ ہدایت ہے کہ اگر وہ تمہارے بچوں کی کفالت کی وجہ سے تم سے وہ تعلق نہ رکھیں جو بیویوں کے ساتھ رکھنا چاہئے، اس میں کوتاہی کریں تو تمہیں اپنے بچوں کی خاطر مصالحت سے کام لینا چاہیے تا کہ تمہارے بچوں کی کفالت بھی ہو سکے اور تمہاری ذات کو بھی ایک سہارا مل جائے، خواہ وہ تمہارے نقطۂ نظر سے کمزور ہی کیوں نہ ہو۔ جانبین کا یہ طرز عمل بھی اصلاح فی الارض ہے۔ مردوں کو ان الفاظ میں ہدایت ہوئی ہے:

وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوا فِي الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَاءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ ذٰلِكَ أَدْنٰى أَلَّا تَعُولُوا (النساء:۴/۳)

اور اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم یتیموں کے معاملے میں انصاف نہ کر سکو گے تو عورتوں (ان کی ماؤں) میں سے جو تمہارے لیے جائز اور سازگار ہوں ان سے دو دو تین تین چار چار تک نکاح کر لو اور اگر ڈر ہو کہ ان کے درمیان عدل نہ کر سکو گے تو ایک ہی پر اکتفا کر و یا پھر جو کوئی تمہارے ملکِ یمین میں ہو۔ یہ طریقہ اس کے زیادہ قریب ہے کہ تم انصاف سے نہ ہٹو۔

اور یتیموں کی ماؤں کو جو ہدایت ہے اس میں ہر چند کہ مردوں کو بھی شامل کرلیا گیا ہے لیکن اصل ہدایت انہی کو ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

وَإِنِ امْرَأَةٌ خَافَتْ مِن بَعْلِهَا نُشُوزاً أَوْ إِعْرَاضاً فَلاَ جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَن يُصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحاً وَالصُّلْحُ خَيْرٌ (النساء:۴/۱۲۸)

اور اگر کسی عورت (یتیم کی ماں) کو اپنے شوہر سے بیزاری یا لاپروائی کا اندیشہ ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں کہ دونوں آپس میں کوئی سمجھوتہ کرلیں اور بایں صورت سمجھوتہ ہی بہتر ہے۔

سماج کی تعمیر میں شوہر اور بیوی کے درمیان خوش گوار تعلقات کی بڑی اہمیت ہے، ان کی باہمی خوشگواری محض ایک خاندان ہی نہیں بلکہ کئی خاندانوں کے باہمی خوشگوار تعلقات کی ضامن ہے اور ان کی باہمی چپقلش کئی خاندانوں کے امن وسکون کو غارت کردینے کے لیے کافی ہے۔ اسی وجہ سے جہاں اسلام نے نکاح کی بڑی حوصلہ افزائی کی ہے وہیں طلاق کو ناپسندیدہ عمل قرار دیا ہے اور اس کی گنجائش صرف اس لیے رکھی گئی ہے کہ بعض حالات میں طلاق ہی شوہر اور بیوی کے اضطراب کا علاج ہے۔ بسا اوقات صرف بیوی کے غلط رویہ کی وجہ سے بھی طلاق کی نوبت آجاتی ہے۔ لیکن ایک یا دو طلاق کے بعد عدت کے دوران بیوی اپنا رویہ درست کرلے تو شوہر کے لیے حکم ہے کہ اسے واپس لے لے۔ عدت گزرنے سے پہلے تو صرف رجوع ہی کافی ہے لیکن عدت گزر جانے کے بعد نئے نکاح کے ساتھ واپسی ہوسکتی ہے۔ اب اگر شوہر اسے واپس لے لیتا ہے تو بیوی کے پرانے غلط رویہ کی وجہ سے اسے تکلیف نہ پہنچائے بلکہ خوش گوار زندگی کے امکانات پیدا کرے، اس کی مردانگی اور فتوت کا تقاضا بھی یہی ہے اور یہ بھی اصلاح فی الارض ہے۔ قرآن کہتا ہے:

وَالْمُطَلَّقَٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنفُسِهِنَّ ثَلاَثَةَ قُرُوٓءٍ وَلاَ يَحِلُّ لَهُنَّ أَن يَكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّهُ فِي أَرْحَامِهِنَّ إِن كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّهِ وَالْيَوْمِ الآخِرِ وَبُعُولَتُهُنَّ أَحَقُّ

اور مطلقہ عورتیں تین قروء تک اپنے آپ کو روکے رکھیں اور اگر وہ اللہ اور یوم آخرت پر یقین رکھتی ہیں تو ان کے لیے جائز نہیں کہ وہ اسے چھپائیں جسے اللہ نے ان کے رحموں میں پیدا کیا ہے اور اس دوران میں

بِرَدِّهِنَّ فِیُ ذَلِکَ إِنُ أَرَادُوا إِصُلاَحاً
(البقرۃ:۲/۲۲۸)

ان کے شوہر انھیں واپس لے لینے کے زیادہ حق دار ہیں بشرطیکہ ان کا ارادہ سازگاری کے ساتھ زندگی گزارنے کا ہو۔

اسلام نے مردوں کو یہ اجازت دی ہے کہ وہ چار بیویاں اپنی زوجیت میں بہ یک وقت رکھ سکتے ہیں لیکن ایک سے زائد بیویاں رکھنے کی صورت میں یہ اندیشہ رہتا ہے کہ سب کی طرف قلبی میلان یکساں نہ ہو، بلکہ قرآن کے بیان کے مطابق یہ ممکن بھی نہیں، کسی کے اضافی اوصاف وکمالات کی وجہ سے اس کی طرف زیادہ جھکاؤ انسانی فطرت کا حصہ ہے، لیکن یہ خیال رکھنا چاہیے کہ وہ سب اپنی ہی بیویاں ہیں اور ان سب کے شوہر پر حقوق ہیں، ان کے حقوق کی پامالی قابل مواخذہ جرم ہے۔ البتہ جب یہ امر مسلّم ہے کہ کسی ایک بیوی کی طرف نسبتاً میلان زیادہ ہوسکتا ہے تو دوسری بیویوں کو بھی اس نزاکت کا احساس کرنا چاہیے اور انھیں تحمل سے کام لینا چاہیے، اس سلسلہ میں شوہر کو مجرم نہیں بلکہ معذور سمجھنا چاہیے اور شوہر اور اس کی اس بیوی کو بھی جس کی طرف قلبی میلان زیادہ ہے دوسری بیویوں کے لیے کچھ اضافی سہولیات کی گنجائش چھوڑنی چاہیے تاکہ ان کے زخموں کا کسی حد تک اندمال ہوجائے، گھریلو ماحول کو بہتر بنائے رکھنے کے لیے جانبین سے یہ گنجائش بھی اصلاح فی الارض کی ایک صورت ہے۔ قرآن کہتا ہے:

وَلَن تَسُتَطِیُعُواُ أَن تَعُدِلُواُ بَیُنَ النِّسَاء
وَلَوُ حَرَصُتُمُ فَلاَ تَمِیُلُواُ کُلَّ الُمَیُلِ
فَتَذَرُوهَا کَالُمُعَلَّقَةِ وَإِن تُصُلِحُواُ
وَتَتَّقُواُ فَإِنَّ اللّهَ کَانَ غَفُوراً رَّحِیُماً
(النساء:۴/۱۲۹)

اور تم تمام بیویوں کے ساتھ پورا پورا انصاف نہیں کرسکتے خواہ تم کتنا ہی چاہو لیکن ایسا تو نہ ہو کہ تم بہر پہلو ایک ہی طرف جھک جاؤ کہ دوسری کو بالکل معلق چھوڑ دو، اگر تم دونوں سمجھوتے کی راہ نکال لو اور اللہ کا ڈر دل میں رکھو تو اللہ بڑا بخشنے والا، رحم فرمانے والا ہے۔

مرد عورتوں پر قوام ہیں۔ ان کی قوامیت دو پہلوؤں سے ہے، ایک تو اس پہلو

سے کہ قوامیت جتنی بڑی ذمہ داری ہے اس کو نبھانے کی صلاحیت مردوں میں ہی ہے، عورتوں میں نہیں۔ دوسرے اس پہلو سے کہ مرد اپنی بیوی کی تمام تر کفالت کی ذمہ داری اپنے سر لیتا ہے اور وہی اس پوزیشن میں ہے بھی کہ اس بڑی ذمہ داری کو اٹھا سکے لیکن بسا اوقات بیوی شوہر کی اس ذمہ دارانہ حیثیت کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتی تو شوہر کا دل اس کی طرف سے ایسا میلا ہو جاتا ہے کہ وہ اس سے قطعِ تعلق کا ارادہ کر لیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایسی صورت میں مرد کو یہ ہدایت دی ہے کہ پہلے بیوی کو سخت لہجے میں سمجھائے تا کہ لہجہ کی سختی سے اس کے اندر کچھ خوف پیدا ہو لیکن اگر وہ اس کے باوجود اپنا رویہ تبدیل نہ کرے تو خواب گاہ میں اپنا بستر اس سے علیحدہ کر لے تا کہ اسے اس مسئلہ کی نزاکت کا احساس ہو جائے لیکن اس کے باوجود اگر وہ نہ سدھرے تو اسے ہلکی سی ضرب بھی لگائی جا سکتی ہے لیکن اگر وہ سختی کی اس زبان کو بھی سمجھنے کے لیے تیار نہ ہو تو وہ مرد اپنے اور اپنی بیوی کے خاندان کے ایک ایک فرد کو بیچ میں ڈالے جو صورت حال کا پتہ لگا کر معاملہ کو درست کرنے کی کوشش کریں۔ اب اگر میاں بیوی دونوں تعلقات کی خوش گواری کے خواہاں ہوں گے تو اس ثالثی کی بدولت اللہ تعالیٰ ان کے تعلقات میں بہتری کی صورت پیدا کر دے گا۔ لیکن اگر دونوں یا دونوں میں سے کوئی ایک اس سازگاری کا خواہاں نہیں ہے تو اب ایک دوسرے سے چھٹکارے کا راستہ طلاق کے علاوہ کچھ نہیں۔ شوہر اور بیوی کے درمیان مطلوب سازگاری کے لیے قرآن نے ''اصلاح'' کا لفظ استعمال کیا ہے جو دلیل ہے اس بات کی کہ یہ بھی اصلاح فی الارض کی ایک صورت ہے۔ فرمایا:

اِنْ يُّرِيْدَا اِصْلَاحاً يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا (النساء:۳۵/۴)	اور اگر یہ دونوں اصلاح کے طالب ہوں تو اللہ تعالیٰ ان کے درمیان موافقت پیدا کر دے گا۔

کسی بھی صاحبِ جائیداد کی جائیداد میں اس کے وارثوں کا حق ہوتا ہے۔ وارثوں کو ان کے حقِ وراثت سے محروم کرنا ایک جرم ہے۔ اس لیے ہر شخص کو اس بات کا اہتمام کرنا چاہیے کہ وہ وصیت کے ذریعہ کسی وارث کو اس کے حق وراثت سے محروم نہ

کرے۔لیکن جن حالات میں وصیت کی اجازت دی گئی ہے وہ بھی حکمت سے خالی نہیں۔ اس حکمت کے تحت وصیت کی جائے تو یہ گناہ نہیں بلکہ باعث اجر وثواب ہے اور اپنی ذمہ داریوں کے احساس کا مظہر ہے۔ البتہ وصیت میں جانب داری یا حق تلفی نہیں ہونی چاہیے۔ وصیت کرنے والے کو جانب داری یا حق تلفی سے روکنا بھی اصلاح فی الارض ہے۔ارشاد ربانی ہے:

فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفاً اَوْ اِثْماً فَاَصْلَحَ بَیْنَھُمْ فَلاَ اِثْمَ عَلَیْهِ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (النساء:۴/۳۵)

جس کو کسی وصیت کرنے والے کی طرف سے کسی جانب داری یا حق تلفی کا اندیشہ ہو پس وہ بیچ میں پڑ کر ان کے درمیان صلح کرادے تو اس پر کوئی گناہ نہیں، بے شک اللہ بڑا بخشنے والا، رحم فرمانے والا ہے۔

صنفی انارکی شرک کے بعد سب سے زیادہ خطرناک سماجی برائی ہے۔ یہ ایک ایسی بیماری ہے جس سے امن وامان غارت ہوجاتا ہے، خاندانوں کے تانے بانے بکھر جاتے ہیں، نسلیں تباہ ہوجاتی ہیں اور حقوق العباد کی ایسی پامالی ہوتی ہے کہ سماج کا ہر طبقہ چیخ اٹھتا ہے۔اس لیے صحیح بات تو یہ ہے کہ اس جرم کی جو سخت ترین سزا اسلام نے تجویز کی ہے اس کے بغیر سماج کے لیے اس بیماری سے نجات پانا ممکن نہیں۔ تاریخ بتاتی ہے کہ جب اور جہاں اس سزا کو اہمیت نہیں دی گئی وہاں کا سماج وحوش و بہائم کی آماجگاہ بن گیا۔ نبی آخرالزماں ﷺ کی آمد سے پہلے کے لوگوں نے بھی ایک طویل عرصے سے اس بیماری کو سنجیدگی سے لینا بند کردیا تھا، اسی کا نتیجہ تھا کہ لوگ لڑکیوں کی پیدائش پر لرز اٹھتے تھے۔ انھوں نے بیماری کا علاج کرنے کے بجائے لڑکیوں کو درگور کرنے میں ہی عافیت سمجھی تھی۔ اسلام نے اس بیماری کا پھر سے علاج تجویز کیا اور سماج کو ایک بڑے اضطراب سے نجات دلائی۔ چونکہ یہ بیماری خطرناک حد تک بڑھ گئی تھی اس لیے علاج بھی بتدریج کیا گیا ہے۔ پہلے یہ عبوری حکم دیا گیا کہ اگر زنا کی مرتکب لڑکی مسلمان ہو اور فریق ثانی غیر مسلم ہو تو چونکہ ابھی غیر مسلموں پر کوئی اختیار نہیں ہے اس لیے مجرم مسلم لڑکی کو اس کے گھر میں قید کردیا

جائے اور اس کے گھر سے باہر کی آمد و رفت پر مکمل پابندی عائد کردی جائے اور اگر زانی اور زانیہ دونوں مسلمان ہوں تو انہیں ایسی سزا دی جائے کہ وہ اپنا رویہ تبدیل کر لینے پر مجبور ہوجائیں۔ اب اگر وہ توبہ کرلیں اور اپنا رویہ درست کرلیں تو ان سے درگزر کیا جائے۔ یہ توبہ کرلینا اور نامناسب رویہ تبدیل کرلینا بھی اصلاح فی الارض ہی ہے۔ جیسا کہ فرمانِ الٰہی ہے:

وَاللاَّتِي يَأْتِينَ الْفَاحِشَةَ مِن نِّسَآئِكُمْ فَاسْتَشْهِدُواْ عَلَيْهِنَّ أَرْبَعةً مِّنكُمْ فَإِن شَهِدُواْ فَأَمْسِكُوهُنَّ فِي الْبُيُوتِ حَتَّىَ يَتَوَفَّاهُنَّ الْمَوْتُ أَوْ يَجْعَلَ اللّهُ لَهُنَّ سَبِيلاً، وَاللَّذَانَ يَأْتِيَانِهَا مِنكُمْ فَآذُوهُمَا فَإِن تَابَا وَأَصْلَحَا فَأَعْرِضُواْ عَنْهُمَا إِنَّ اللّهَ كَانَ تَوَّاباً رَّحِيماً

(النساء:۴/۱۵-۱۶)

اور تمہاری عورتوں میں سے جو بدکاری کی مرتکب ہوں ان پر اپنے اندر کے چار گواہ لاؤ، پس اگر وہ گواہی دے دیں تو ان کو گھروں کے اندر قید کردو یہاں تک کہ موت ان کا خاتمہ کردیں یا پھر اللہ ان کے لیے کوئی راہ نکالے، اور جو دونوں اس بدکاری کا ارتکاب کریں اگر وہ تمہارے اندر کے ہوں تو انھیں ایذا پہنچاؤ، اب اگر وہ توبہ کرلیں اور اپنی اصلاح کرلیں تو ان سے درگزر کرو، بیشک اللہ بڑا توبہ قبول کرنے والا رحم کرنے والا ہے۔

اسلام پوری انسانیت کا دین ہے۔ اس کا انتخاب سارے انسانوں کے لیے خود اللہ تعالیٰ نے کیا ہے۔ اس کی ہدایات وتعلیمات انسانی فطرت کے عین مطابق ہیں۔ اس لیے کسی بھی انسان کو اس سے بیر نہیں ہونا چاہیے بلکہ اس کی ہدایات وتعلیمات کو صدائے دل سمجھ کر قبول کرنا چاہیے۔ لیکن حیف کہ انسانوں کی بڑی اکثریت نہ صرف یہ کہ اس سے گریزاں ہے بلکہ اس کی دشمن ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جنھیں کتاب وشریعت سے نوازا ہے اور وہ دنیا میں اہل کتاب کی حیثیت سے معروف ہیں وہ بھی اس کے دشمن بنے ہوئے ہیں۔ حالاں کہ ان کے پیش رووں نے آخری کتاب اور آخری رسول ﷺ پر ایمان لانے کا وعدہ

بھی کیا تھا۔ بڑے بدنصیب ہیں وہ اخلاف جنھیں اپنے اسلاف کا وعدہ و اقرار یادنہیں۔ البتہ وہ اہل کتاب یقیناً خوش بخت ہیں جنھیں یاددہانی کے بعد ایمان و اسلام کی توفیق ملی۔ حق کے آجانے کے بعد اسے قبول کرلینا اور اپنی سابقہ زندگی کو یکسر تبدیل کرلینا بھی اصلاح فی الارض ہے۔ جیسا کہ سورہ آل عمران میں اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کے میثاق کا ذکر کرنے، پھراس سے اکثریت کے مکر جانے کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا:

اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا مِنْ بَعْدِ ذٰلِکَ وَاَصْلَحُوْا فَاِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (آل عمران:۳/۸۹)

مگر جن لوگوں نے توبہ اور اصلاح کرلی تو بے شک اللہ بڑا بخشنے والا، رحم فرمانے والا ہے۔

اسی طرح منافقین کے اسلام کے اعلان و اظہار کے بعد اس کے خلاف ریشہ دوانیاں کرنے پر اللہ تعالیٰ نے انھیں یہ وعید سنائی کہ ان کی یہ پالیسی انھیں لے ڈوبے گی۔ دنیا میں بھی انھیں رسوائی کا منہ دیکھنا پڑے گا اور آخرت میں ان کا انجام یہ ہوگا کہ جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں ڈالے جائیں گے سوائے ان کے جنھیں توبہ و اصلاح کی توفیق ملی۔ فرمانِ الٰہی ہے:

اِنَّ الْمُنٰفِقِیْنَ فِی الدَّرْکِ الْاَسْفَلِ مِنَ النَّارِ وَلَنْ تَجِدَ لَھُمْ نَصِیْراً اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا وَاعْتَصَمُوْا بِاللّٰہِ وَاَخْلَصُوْا دِیْنَھُمْ لِلّٰہِ (النساء:۴/۱۴۶)

یقیناً منافقین جہنم کے سب سے نچلے طبقے میں ہوں گے اور تم ان کا کوئی مددگار نہ پاؤ گے سوائے ان کے جنھوں نے توبہ اور اصلاح کرلی اور اللہ کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور اپنی اطاعت اللہ کے لیے خالص کردی۔

چوری بھی ایک خطرناک بیماری ہے، یہ بھی پورے سماج کو متاثر کرتی ہے۔ اس سے ایک تو اس کی حق تلفی ہوتی ہے جس نے بڑی محنت سے مال کمایا لیکن وہ اس سے فائدہ نہیں اٹھا سکا، ایک چور نے اس پر ہاتھ صاف کرکے اسے نقصان پہنچایا، ثانیاً اس کی آرزوؤں اور تمناؤں کا خون کردیا، جس کے مال کی چوری ہوتی ہے کوئی اس کے دل سے

پوچھے کہ اس پر کیا گزری؟ تیسرے وہ اپنے اس عمل سے خود اپنے اوپر ظلم کرتا ہے کیوں کہ اگر وہ چوری کے جرم میں پکڑا گیا تو دنیا میں بھی اسے عبرت ناک سزا سے دوچار ہونا پڑے گا لیکن اگر یہاں نہ بھی پکڑا گیا تو اس کی آخرت بہر حال تباہ ہونی ہے۔

اب اگر کوئی چوری کرتا ہے لیکن بعد میں وہ تائب ہو جاتا ہے اور آئندہ ایسی حرکت نہ کرنے کا پختہ عہد کرتا ہے تو یہ بھی اصلاح فی الارض ہے کیوں کہ اولاً اس نے اپنی اصلاح کرلی۔ ثانیاً آئندہ اپنی ذات سے دوسروں کو نقصان نہ پہنچانے کا عہد کرلیا۔ اسی وجہ سے قرآن اس طرز عمل کے لیے بھی اصلاح کی تعبیر اختیار کرتا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْا اَيْدِيَهُمَا جَزَاءً بِمَا كَسَبَا نَكَالاً مِنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ، فَمَنْ تَابَ مِنْ بَعْدِ ظُلْمِهٖ وَاَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۔

(المائدۃ: ۵/۳۸-۳۹)

اور چور مرد اور چور عورت دونوں کے ہاتھ کاٹ دو، اس کی پاداش میں جو انھوں نے کیا، اللہ کی طرف سے عبرتناک سزا کے طور پر اور اللہ غلبہ والا، حکمت والا ہے۔ پس جس نے اپنے اس جرم کے بعد توبہ کرلی اور اپنا رویہ آئندہ کے لیے درست کرلیا تو اللہ تعالیٰ اس کی توبہ قبول فرمائے گا، یقیناً اللہ بڑا بخشنے والا رحم فرمانے والا ہے۔

ایک مومن دانستہ غلطی نہیں کرتا لیکن چونکہ وہ بشر ہوتا ہے اور بشر سے بتقاضائے بشریت غلطی ہو جاتی ہے، اب اگر نادانستہ یا نادانی میں اس سے غلطی ہو جاتی ہے اور احساس ہوتے ہی وہ توبہ کرلیتا ہے تو اپنے توبہ کے ذریعہ دوسروں کو یہ عملی پیغام دیتا ہے کہ اولاً کسی کو بھی ایسی غلطی دانستہ نہیں کرنی چاہیے اور اگر نادانستہ یا نادانی میں کوئی غلطی ہو جائے تو اس پر ندامت ہونی چاہیے اور آئندہ اس غلطی کو دہرانے کی جرأت نہیں کرنی چاہیے۔ مومن کا یہ کردار بھی اصلاح فی الارض ہے۔ فرمان خداوندی ہے:

وَإِذَا جَاءَكَ الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ كَتَبَ رَبُّكُمْ عَلٰى نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ اَنَّهُ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْءً بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ مِنْ بَعْدِهِ وَاَصْلَحَ فَاَنَّهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (الانعام:۶/۵۴)

اور اے نبی! جب تمہارے پاس وہ لوگ آیا کریں جو ہماری آیات پر ایمان لاتے ہیں تو تم سلام علیکم کہہ کر ان کا استقبال کرو اور کہو کہ تمہارے رب نے اپنے اوپر رحمت واجب کر رکھی ہے کہ تم میں سے جو کوئی نادانی میں کوئی برائی کر بیٹھے گا لیکن اس کے بعد توبہ اور اصلاح کر لے گا تو وہ بڑا بخشنے والا رحم فرمانے والا ہے۔

ایک دوسری جگہ فرمایا:

ثُمَّ اِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِيْنَ عَمِلُوا السُّوْءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابُوْا وَاَصْلَحُوْا اِنَّ رَبَّكَ مِنْ بَعْدِهَا لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ. (النحل:۱۶/۱۱۹)

پھر تمہارا رب ان لوگوں کے لیے جو نادانی کر بیٹھیں پھر توبہ اور اصلاح کر لیں تو بے شک تمہارا رب اس کے بعد بڑا بخشنے والا، نہایت رحم کرنے والا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہی آسمانوں اور زمین کا خالق ہے، گردش لیل ونہار اسی کے امر واذن سے ہیں۔ آفتاب و ماہتاب اور نجوم وکواکب سب اسی کے تابعِ فرمان ہیں، خلق وامر کا اختیار اسی کو ہے۔ اسی کے ہاتھ میں کائنات کی باگ ڈور ہے۔ اسی وجہ سے نظام عالم میں حیرت انگیز توافق اور سازگاری نظر آ رہی ہے۔ جو لوگ دوسروں کو اللہ کا شریک ٹھہراتے ہیں اور اس کے اختیارات فرضی خداؤں میں تقسیم کر دیتے ہیں وہ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ اگر ان کے مالک الگ الگ ہوتے تو جو توافق اور سازگاری نظر آ رہی ہے وہ ناپید ہوتی۔ ان فرضی معبودوں کو خدا کی خدائی میں شریک کرنا نظامِ اصلاح عالم میں خلل ڈالنے کی کوشش کرنا ہے۔ کائنات کی تمام چیزوں میں جو توافق ہے قرآن نے اسے اصلاح سے تعبیر کیا ہے اور شرک کے بکھیڑے کو فساد قرار دیا ہے۔ ارشاد ہوا:

لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا (الاعراف:۷/۶۵)

زمین میں اس کی اصلاح کے بعد فساد نہ برپا کرو۔

تجارت ہمیشہ سے ایک معروف اور مفید پیشہ رہی ہے۔ ایمان دارانہ تجارت سے سماج کو جو سکون ملتا ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ لیکن جس تجارت میں بد دیانتی اور بے ایمانی ہوتی ہے اس کا سماج پر منفی اثر ایک فطری چیز ہے۔ جو لوگ سماج کو ترقی دینا چاہتے ہیں وہ ایمان دارانہ تجارت کے فروغ پر یقین رکھتے ہیں، اس سے کردار میں عظمت اور اخلاق میں بلندی پیدا ہوتی ہے۔ جس سماج کے افراد میں اخلاق و کردار کی بلندی پیدا ہوجائے اس کی ترقی یقینی ہے۔ اس کے برعکس جس سماج کے لوگوں میں اخلاق کی پستی اور کردار کی گراوٹ پیدا ہوجائے اس کا زوال وادبار لابدی ہے، ہر نبی اپنی قوم کو اخلاق و کردار کی بلند چوٹی پر پہنچانا چاہتا تھا۔ انہی نبیوں میں سے ایک مشہور نبی حضرت شعیب علیہ السلام ہیں، ان کی قوم تجارت پیشہ تھی، ان میں اتنی پستی آگئی تھی کہ لینے کا باٹ الگ اور دینے کا باٹ الگ رکھتے تھے۔ مہاجن اپنے گراہکوں کو لوٹتے اور ان کا استحصال کرتے تھے اس وجہ سے عوام اپنے خواص سے نفرت کرنے لگے تھے اور جب ماحول نفرت کا بن جائے تو سماج کو شکست و ریخت سے بچایا نہیں جاسکتا۔ دیانت دارانہ تجارت اصلاح فی الارض ہے جبکہ بددیانتی پر مبنی تجارت افساد فی الارض ہے۔ اس صورتِ حال میں حضرت شعیبؑ نے اپنی قوم کو جو نصیحت کی وہ قرآن میں ان الفاظ میں مذکور ہے:

يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلٰهٍ غَيْرُهُ قَدْ جَاءَتْكُم بَيِّنَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ فَأَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ (الاعراف: ۸۵/۷)	اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی عبادت کرو، اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں، تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے واضح دلیل آچکی ہے تو ناپ تول پورا کرو اور لوگوں کو ان کی چیزیں کم نہ دو اور زمین میں اس کی اصلاح کے بعد فساد نہ برپا کرو، یہی تمہارے حق میں بہتر ہے اگر تم ایمان رکھتے ہو۔

حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہما السلام بنی اسرائیل میں پیغمبر بنا کر بھیجے گئے

تھے۔ جب حضرت موسیٰ کو اللہ تعالیٰ نے تورات دینے کے لیے طور پر بلایا تو انھوں نے اپنے بھائی اور رسول حضرت ہارون علیہ السلام کو یہ ہدایت فرمائی کہ میری عدم موجودگی میں میری جانشینی کرنا اور قوم کے احوال پر کڑی نظر رکھنا، کیوں کہ جماعت میں کچھ مفسدین ہیں، وہ قوم کو گمراہ کر سکتے ہیں۔ کہیں کوئی کمی دیکھنا تو فوراً اس کی اصلاح کر دینا۔ ذرا بھی سستی مسائل پیدا کر سکتی ہے۔ یہاں قوم کے احوال پر نظر رکھنے اور بصورت کوتاہی فوراً اصلاح پر توجہ دینے کا جو حکم دیا ہے وہ اصلاح فی الارض ہی ہے۔ فرمان الٰہی ہے:

اخْلُفْنِیْ فِیْ قَوْمِیْ وَاَصْلِحْ وَلاَ تَتَّبِعْ سَبِیْلَ الْمُفْسِدِیْنَ. (الاعراف:۱۴۲/۷)

میری قوم میں میری جانشینی کرنا، اصلاح کرتے رہنا اور مفسدوں کی روش کی پیروی نہ کرنا۔

تمسک بالکتاب اور اقامت صلوٰۃ بھی اصلاحی کام ہیں۔ ان پر اللہ تعالیٰ نے بہترین اجر کی ضمانت دی ہے۔ ارشاد ربانی ہے:

وَالَّذِیْنَ یُمَسِّکُوْنَ بِالْکِتَابِ وَأَقَامُوْا الصَّلٰوۃَ إِنَّا لاَ نُضِیْعُ أَجْرَ الْمُصْلِحِیْنَ (الاعراف:۱۷۰/۷)

اور جو لوگ کتاب الٰہی کو مضبوطی سے تھامتے اور نماز کا اہتمام کرتے ہیں وہ مصلح ہیں اور ہم مصلحین کے اجر کو بالکل ہی ضائع نہیں کریں گے۔

غزوۂ بدر کفر و اسلام کی پہلی منظم جنگ ہے۔ اس میں مسلمانوں کی تعداد جتنی تھی اس سے تین گنا زیادہ تعداد کافروں کی تھی۔ کافروں کی فوج میں سب کے سب مسلح اور تجربہ کار جنگ جو تھے جب کہ مسلمانوں کی صف میں اسلحے کم تھے اور ان کی تعداد بھی کم تھی۔ اس کے باوجود میدان مسلمانوں کے ہاتھ رہا۔ کافروں کی شکست کے بعد جو مالِ غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ لگا وہ سب اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے اکٹھا کیا گیا اور مسئلہ یہ درپیش ہوا کہ یہ کس کا حق ہے؟ بعض مسلمانوں کا خیال تھا کہ حسب روایت عہد جاہلی جنگ میں حصہ لینے والوں کا ہے لیکن جو مسلمان میدان جنگ کے بجائے دوسرے مورچوں پر مامور تھے وہ سمجھتے تھے کہ ہمارا بھی اس میں حصہ ہے کیوں کہ ہم بھی کسی

نہ کسی مورچہ پر ہی تھے۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ نازل فرمایا کہ مال غنیمت اللہ اور اس کے رسول کا حق ہے۔ وہ اس میں سے جتنا جس کو چاہیں دیں کسی کو اعتراض نہیں۔ کیوں کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول سے زیادہ انصاف کرنے والا کوئی دوسرا نہیں ہوسکتا۔ سارے اہل اسلام نے اس فیصلۂ خداوندی کو بسر وچشم تسلیم قبول کیا۔ چونکہ اس موقع پر دعوائے استحقاق کی ایسی صورت سامنے آگئی تھی جس میں اللہ اور اس کے رسول کی صوابدید کا کوئی ذکر نہیں تھا اس لیے حکمتِ تربیت اس بات کی مقتضی ہوئی کہ برمحل ان اہل ایمان کی تربیت کردی جائے، اس واقعہ سے اہل ایمان کی جو کمزوری سامنے آئی وہ دو طرح کی تھی۔ ایک تو یہ کہ اللہ اور اس کے رسول کا جو مرتبہ و مقام ہے وہ پیش نظر رکھا نہیں جا سکا۔ دوسرے باہم حسد کا جذبہ ابھر آیا اور یہ دونوں ہی کمزوریاں کسی آئیڈیل جماعت کے لیے خطرناک ثابت ہوسکتی تھیں۔ رہی یہ بات کہ اہل ایمان کی طرف سے اس قسم کی کمزوریاں کیسے صادر ہوگئیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اپنی نوعیت کا بالکل نیا واقعہ اسلامی زندگی میں پیش آیا تھا اس لیے اجتہاد میں غلطی ہوگئی۔

ان دونوں کمزوریوں پر قابو پانے کے لیے ایک تو تقویٰ کی یاد دہانی کرائی گئی، دوسرے اصلاح ذات البین کی تلقین کی گئی جو اصلاح فی الاض کا نہایت اہم وسیلہ ہے۔ متعلقہ آیت ملاحظہ ہو:

يَسْأَلُونَكَ عَنِ الأَنفَالِ قُلِ الأَنفَالُ لِلّهِ وَالرَّسُولِ فَاتَّقُواْ اللّهَ وَأَصْلِحُواْ ذَاتَ بِيْنِكُمْ وَأَطِيعُواْ اللّهَ وَرَسُولَهُ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِين. (الانفال:۱/۱۰)	وہ تم سے اموال غنیمت کے بارے میں سوال کرتے ہیں کہہ دو اموال غنیمت اللہ اور اس کے رسول کا حق ہے، پس اللہ سے ڈرو اور اپنے باہمی تعلقات کو استوار رکھو اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو اگر تم مومن ہو۔

حضرت شعیب علیہ السلام اپنی قوم کو ان اخلاقی بیماریوں سے پاک کرنا چاہتے تھے جو ان کے اندر پیدا ہوگئی تھیں جن میں سے ایک لین دین میں کمی بیشی بھی تھی جیسا کہ

پہلے بیان کیا گیا، لیکن ان کی اکثریت اپنے نبی کی بات پر کان دھرنے کے لیے تیار نہیں تھی، الٹا ان سے کج بحثی کرتی رہی۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے ان کی کج بحثیوں کے جواب میں فرمایا: ''اے میری قوم کے لوگو! تم خود ہی سوچو کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف سے جو واضح دلیل دی ہے جس کی وجہ سے میں بالکل مطمئن ہوں کہ میرا راستہ بالکل صحیح اور درست ہے اور اس نے مجھے جو رزقِ حسن عطا فرمایا ہے اگر میں تمھیں اس کی طرف دعوت نہ دوں تو کس کی طرف دعوت دوں؟ کیا خیر خواہی کا تقاضا یہی ہے کہ جس چیز پر اطمینان ہو اس کی طرف نہ بلاؤں اور جس چیز پر اطمینان نہ ہو اس کی طرف بلاؤں۔ میں تو اپنی طرح تمھارے احوال کی اصلاح کا بھی خواہاں ہوں؟ اس سے بڑی قوم کی خیر خواہی اور کیا ہو سکتی ہے؟ درستگیٔ احوال کی تمنا اور خواہش کو بھی قرآن نے اصلاح ہی سے تعبیر کیا ہے۔ قرآن نے حضرت شعیب علیہ السلام کی دعوت کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

يٰقَوْمِ أَرَأَيْتُمْ إِنْ كُنْتُ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَرَزَقَنِيْ مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا وَمَا أُرِيْدُ أَنْ أُخَالِفَكُمْ إِلَىٰ مَا أَنْهٰكُمْ عَنْهُ إِنْ أُرِيْدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ وَمَا تَوْفِيْقِيْ إِلَّا بِاللّٰهِ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيْبُ (ہود:۱۱/۸۸)

اے میری قوم کے لوگو! ذرا غور کرو گے کہ اگر میں اپنے رب کی طرف سے ایک واضح دلیل پر ہوں اور اس نے مجھے رزق حسن سے بھی نوازا (تو میں تمھیں آخر اس کے علاوہ کس چیز کی طرف دعوت دوں؟) اور میں نہیں چاہتا کہ میں تمھاری مخالفت کر کے وہی کروں جس سے تمھیں روک رہا ہوں میں تو صرف تمھاری اصلاح چاہتا ہوں جس حد تک مجھ سے ہو سکے اور مجھے تو توفیق اللہ ہی سے ملے گی۔ اسی پر میں نے بھروسہ کیا ہے اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔

جو لوگ اپنی بستی کے بگڑے ہوئے لوگوں کو راہ راست پر لانے کی کوشش کرتے ہیں ان کی بستی عذاب الٰہی سے محفوظ رہتی ہے جیسا کہ قرآن کہتا ہے:

وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرَى بِظُلْمٍ وَأَهْلُهَا مُصْلِحُونَ (ہود:۱۱/۱۱۷)

اور تیرا رب ایسا نہیں ہے کہ وہ بستیوں کو ہلاک کردے (کچھ لوگوں کے) ظلم کی پاداش میں دراں حالیکہ ان کے باشندوں کی اکثریت اصلاح کا کام کررہی ہو۔

حضرت زکریا علیہ السلام بنی اسرائیل کے ایک جلیل القدر پیغمبر گزرے ہیں وہ بڑھاپے کی آخری منزل کو پہنچ چکے تھے۔ اس عمر میں انھیں یہ فکر بہت زیادہ ستانے لگی کہ ان کی اپنی کوئی اولاد نہیں ہے جس کی تربیت کر کے اسے اپنا دینی وارث بنا دیتے اور باہر بھی کوئی ایسا نظر نہیں آرہا ہے جو اس دینی وراثت کو سنبھال سکے۔ ایسے مایوس کن حالات میں انھوں نے اپنا یہ درد اللہ تعالیٰ سے بیان کیا، اللہ تعالیٰ نے ان کی درخواست منظور فرما کر ان کے درد کا درماں مہیا کر دیا، بایں طور کہ انھیں اولاد کی بشارت دی، لیکن چونکہ وہ خود شیخ بالی تھے اور ان کی بیوی بھی آئسہ ہو چکی تھیں اور عمر کی اس منزل میں پہنچ چکی تھیں جس میں زچگی کا امکان نہیں تھا لیکن اللہ تعالیٰ نے امکان پیدا کیا اور انھیں شوہر کے لیے اس پہلو سے سازگار بنادیا۔ اس سازگاری کے لئے قرآن نے لفظ اصلاح کا استعمال کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی بے صلاحیت کے اندر صلاحیت پیدا کردینا اور اسے کام کے لیے سازگار بنادینا بھی اصلاح ہے۔ حضرت زکریاؑ کے حوالہ سے قرآن کا بیان ملاحظہ کیجئے:

وَزَكَرِيَّا إِذْ نَادَى رَبَّهُ رَبِّ لَا تَذَرْنِي فَرْداً وَأَنتَ خَيْرُ الْوَارِثِينَ ، فَاسْتَجَبْنَا لَهُ وَوَهَبْنَا لَهُ يَحْيَى وَأَصْلَحْنَا لَهُ زَوْجَهُ (الانبیاء:۲۱/۸۹-۹۰)

اور ہم نے زکریا پر بھی اپنا فضل کیا جب اس نے اپنے رب کو پکارا کہ اے میرے رب! مجھے تنہا نہ چھوڑ اور تو بہترین وارث ہے تو ہم نے اس کی دعا قبول کی اور ہم نے اس کو یحییٰ عطا کیا اور اس کی بیوی کو اس کے لیے سازگار بنادیا۔

بہت سے لوگ ہوتے ہیں جو پاکباز عورتوں پر بدچلنی کا الزام لگادیتے ہیں چاہے اس لیے کہ وہ ان کی ناپسندیدہ بیویاں ہیں، ان سے جان چھڑانا چاہتے ہیں۔ یا اس

لیے کہ وہ خود نا اہل ہیں، اپنا عیب چھپانے کے لیے ان کو یہ راستہ آسان معلوم ہوتا ہے یا اس لیے کہ وہ ان خواتین یا ان کے اہل خانہ کو رسوا کرنا چاہتے ہیں۔ اگر کسی نے ان میں سے کسی ایک بھی محرک کے سبب ایک پاکباز عورت پر تہمت لگائی تو اللہ کے نزدیک وہ سنگین جرم کا مرتکب ہوا ہے اور اس کے لیے اسّی کوڑوں کی سزا ہے۔ لیکن اگر سزا پانے کے بعد وہ زندہ رہتا ہے اور اپنے کئے پر پچھتاتا ہے، توبہ کر لیتا ہے اور آئندہ کے لیے وہ اپنی اس روش کی اصلاح کر لیتا ہے تو یہ بھی اصلاح فی الارض ہے کیوں کہ آئندہ اہل زمین اس کے اس شر سے محفوظ رہیں گے۔ فرمانِ الٰہی ہے:

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَأْتُوْا بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً أَبَدًا وَأُولٰئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ إِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ وَأَصْلَحُوْا فَإِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (النور:۲۴/۴-۵)

اور جو لوگ پاکباز عورتوں پر الزام لگائیں پھر وہ چار گواہ پیش نہ کر سکیں تو ان کو اسّی کوڑے مارو اور ان کی کوئی گواہی کبھی قبول نہ کرو، یہی لوگ فاسق ہیں۔ البتہ جن لوگوں نے توبہ کر لی اور اپنے اس رویہ کی اصلاح کر لی تو یقیناً اللہ بڑا بخشنے والا، رحم فرمانے والا ہے۔

حضرت صالح علیہ السلام قوم ثمود کے نبی تھے، جس شہر میں وہ قیام پذیر تھے اس میں قوم ثمود کے کل نو (۹) خاندان رہتے تھے۔ ایک طرف حضرت صالح علیہ السلام تھے جو لوگوں کی صحیح رہنمائی کرتے تھے تو دوسری طرف یہ نو خاندان تھے جن کے سربراہ اپنے عوام کی غلط رہنمائی کرتے تھے۔

دنیا میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو دنیوی آسائشوں میں زندگی بسر کرتے اور اپنی تگ و دو کا مرکز و محور دنیا کو بناتے ہیں، آخرت میں اللہ کے سامنے جواب دہی کا احساس بالکل نہیں رکھتے اور گمراہ قائدین بھی ان کی پیٹھ ٹھونکتے رہتے ہیں کہ خوب۔ یہی تو کام ہیں کرنے کے۔ جو لوگ صحیح رہنمائی فراہم کرنے کے بجائے غلط بجھاؤ دیتے رہتے ہیں ان کے اس عمل کو قرآن نے افساد فی الارض اور جو لوگ صحیح رہنمائی فراہم کرتے ہیں

ان کے اس عمل کو اصلاح فی الارض قرار دیا ہے۔ قرآن نے حضرت صالح علیہ السلام کی یہ رہنمائی نقل کی ہے:

وَلاَ تُطِيعُوا اَمْرَ الْمُفْسِدِيْنَ الَّذِيْنَ يُفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلاَ يُصْلِحُوْنَ (الشعراء: ۱۵۲/۲۶)

اور تم حد سے تجاوز کر جانے والوں کی بات نہ مانو جو غلط رہنمائی فراہم کر کے زمین میں فساد پھیلاتے ہیں اور اصلاح کا کام نہیں کرتے۔

ایک دوسری جگہ ہے:

وَكَانَ فِي الْمَدِيْنَةِ تِسْعَةُ رَهْطٍ يُّفْسِدُوْنَ فِي الْاَرْضِ وَلاَ يُصْلِحُوْنَ (النمل: ۴۸/۲۷)

اور شہر میں نو خاندان تھے جن کے خواص اپنے عوام کی غلط رہنمائی کر کے شہر میں فساد پھیلاتے تھے اور اصلاح کا کام نہیں کرتے تھے۔

انسان ایک ذمہ دار مخلوق ہے۔ اس کے اس ذمہ دارانہ منصب کا تقاضا ہے کہ وہ وہی کرے جس کے لیے اسے یہ منصب تفویض ہوا ہے اور ظاہر ہے کہ جس نے یہ منصب عطا کیا ہے وہی بتائے گا کہ اس کی ذمہ داریاں کیا ہیں؟ چنانچہ اس نے قرآن کی صورت میں ذمہ داریوں کی تفصیل بھیج دی ہے۔ قرآن پڑھنا، اس سے اپنی ذمہ داریاں معلوم کرنا اور ان ذمہ داریوں کے تقاضوں کو پورا کرنا ہی دراصل عمل صالح ہے اور ہر صالح بندہ کی خواہش ہوگی کہ وہ خود بھی عمل صالح کرے اور اس کی اولاد بھی عمل صالح کرے۔ چونکہ کوئی شخص بھی توفیق الٰہی کے بغیر عمل صالح نہیں کرسکتا اس لیے ہر شخص کو اللہ تعالیٰ سے یہ دعا بھی کرتے رہنا چاہیے کہ اے اللہ ہمیں عمل صالح کی توفیق عطا فرما۔

قرآن نے ایک صالح بندہ کی شان یہ بتائی ہے کہ وہ یہ دعا کرتا رہتا ہے:

رَبِّ أَوْزِعْنِيْ أَنْ أَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْ أَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلَى وَالِدَيَّ وَأَنْ أَعْمَلَ صَالِحاً تَرْضٰهُ وَأَصْلِحْ لِيْ فِيْ

اے میرے رب مجھے سنبھال کہ میں تیری اس نعمت کا شکر ادا کروں جو تو نے مجھے اور میرے والدین کو عطا فرمائی ہے اور میں وہ نیک عمل

ذُرِّیَّتِیْ اِنِّیْ تُبْتُ اِلَیْکَ وَاِنِّیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ. (الاحقاف:۴۶/۱۵)

کروں جس سے تو راضی ہوجائے اور میرے لیے میری اولاد کے باب میں توفیق ارزاں فرما، میں نے تیری طرف رجوع کیا اور بلاشبہ میں مسلمانوں میں سے ہوں۔

انسان اجتماعی زندگی گزارنے پر مجبور ہے اور بالعموم ایک فکر اور مذہب کے لوگ ایک ساتھ رہنا پسند کرتے ہیں۔اب اگر کسی بستی کے مسلمان کسی مسئلہ میں آپس میں ٹکرا جائیں تو ان کا ٹکرانا پوری بستی کے لیے شگون بد ہی ہوگا۔اس وجہ سے جو مسلمان براہِ راست اس معاملہ میں فریق نہیں ہیں، ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ فریقین کے درمیان پڑ کر اس ٹکراؤ کو ختم کرائیں اور باہم صلح کرادیں۔ البتہ صلح کرانے میں اس بات کا خیال رکھیں کہ کسی کی حق تلفی نہ ہو۔اگر دونوں میں سے کوئی ایک فریق اپنی ضد پر اڑ جائے اور دوسرے کی حق تلفی کے بغیر صلح کے لیے آمادہ نہ ہو تو باقی تمام مسلمانوں کی ذمہ داری ہے کہ اس ظالم کے خلاف اجتماعی طور سے اٹھ کھڑے ہوں تا آں کہ وہ تھک ہار کر صلح کے لیے آمادہ ہوجائے اور اگر وہ صلح کے لیے آمادہ ہوجائے تو اس کے قدیم غلط رویہ کو بنیاد بنا کر اس کی حق تلفی نہ کی جائے بلکہ انصاف کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے ان کے درمیان صلح کرادی جائے، یہ ساری کوششیں اصلاح فی الارض ہیں۔ قرآن کہتا ہے:

وَإِن طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا فَإِن بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتَّى تَفِيْءَ إِلَى أَمْرِ اللَّهِ فَإِن فَاءَتْ فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَأَقْسِطُوا إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ إِخْوَةٌ فَأَصْلِحُوا بَيْنَ

اور اگر مومنین کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان صلح کراؤ پس اگر ان میں سے ایک دوسرے پر زیادتی کرے تو اس سے جنگ کرو جو زیادتی کرے تا آں کہ وہ فیصلۂ خداوندی کی طرف لوٹ آئے پس اگر وہ لوٹ آتا ہے تو فریقین کے درمیان عدل کے ساتھ مصالحت کرادو اور انصاف کے تقاضوں کو

أَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ (الحجرات: ۴۹/۹-۱۰)

پورا کرو، بیشک اللہ انصاف کے تقاضوں کو پورا کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے۔ مومن تو آپس میں بھائی بھائی ہیں سو اپنے بھائیوں کے درمیان مصالحت کراؤ اور اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔

حضرت آدم علیہ السلام کو جب اللہ تعالیٰ نے دنیا میں بھیجا تو ان سے اور ان کے توسط سے ذریت آدم سے یہ عہد لیا کہ اگر تمہارے پاس ہمارے رسول ہماری ہدایت لے کر آئیں تو ان کی ہدایت کو تسلیم کرنا۔ تم میں سے جو اپنے دلوں میں اللہ کا ڈر پیدا کریں گے اور اپنے احوال درست کرلیں گے ان کے لیے جنت کی آسائشوں کی بشارت ہے۔ ہدایاتِ خداوندی کے مطابق اپنے احوال کو درست کرلینا بھی اصلاح فی الارض ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

يَا بَنِيْ آدَمَ إِمَّا يَأْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنكُمْ يَقُصُّونَ عَلَيْكُمْ آيَاتِيْ فَمَنِ اتَّقَى وَأَصْلَحَ فَلاَ خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلاَ هُمْ يَحْزَنُونَ (الاعراف: ۳۵/۷)

اے بنی آدم اگر تمہارے پاس تمہارے اندر سے کچھ رسول آئیں تم کو میری آیات سناتے ہوئے تو سن لو کہ جنھوں نے تقویٰ اختیار کیا اور اپنی اصلاح کرلی ان کے لیے نہ کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کو یہ حق دیا ہے کہ اگر کسی نے اس کے اوپر ظلم کیا ہے تو وہ اسی کے بقدر اس سے انتقام لے سکتا ہے۔ لیکن قانون کو ہاتھ میں لیتے ہوئے نہیں بلکہ قانونی چارہ جوئی کرتے ہوئے۔ لیکن اگر زیادتی کا شکار انتقام لینے کے بجائے معاف کردے تو یہ زیادہ بہتر اور پسندیدہ ہے بشرطیکہ ظالم کا حوصلہ اس سے اور بلند نہ ہو، لیکن صرف معاف کردینا کافی نہیں ہے ورنہ اسے بزدلی اور کمزوری پر محمول کیا جائے گا، صحیح طریقہ یہ ہے کہ معاف کرنے کے ساتھ وہ یہ بھی دیکھے کہ خود اس سے کوئی ایسی غلطی صادر تو نہیں ہوگئی ہے جس کے سبب اسے زیادتی کا شکار ہونا پڑا۔ اگر ایسا ہے تو فوراً اسے اپنی

اصلاح کی طرف توجہ دینی چاہیے اور یہ عزم مصمم کرنا چاہیے کہ آئندہ اس غلطی کو نہیں دہرائے گا۔لیکن اگر اس کی سمجھ میں یہ آرہا ہے کہ اس نے کوئی غلطی نہیں کی ہے بلکہ زیادتی کرنے والا ہی ظالم ہے تو جس حد تک ممکن ہو وہ اس کی اصلاح کرنے کی کوشش کرے، اگر یہ کوشش بلاواسطہ ہوسکتی ہے تو بلا واسطہ کرے اور اگر بالواسطہ ہی ممکن ہو تو بالواسطہ کرے یہ بھی اصلاح فی الاض ہے۔قرآن کہتا ہے:

وَجَزَاء سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَأَصْلَحَ فَأَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ إِنَّهُ لَا يُحِبُّ الظَّٰلِمِينَ (الشوریٰ:۴۲/۴۰)	اور کسی برائی کا بدلہ اسی کے بقدر ہے لیکن جس نے درگزر سے کام لیا اور اصلاح کی تو اس کا اجر اللہ کے ذمہ ہے۔وہ ظالموں کو بالکل پسند نہیں کرتا۔

اللہ تعالیٰ نے نبیوں اور رسولوں کو داعی الی اللہ بنا کر بھیجا ہے لیکن ظاہر ہے کہ سارے انسانوں کو ان کی دعوت قبول کر لینے کی توفیق نہیں ملتی۔جن خوش نصیبوں کو ان کی دعوت قبول کر لینے کی توفیق ملتی ہے ان کے لیے وہ مبشر ہوتے ہیں اور جو اس نعمت سے محروم رہ جاتے ہیں ان کے لیے منذر رہوتے ہیں۔اس انذار کا فائدہ اٹھا کر جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور انکار کی روش چھوڑ کر حق کا اقرار کر لیتے ہیں وہ بھی مصلح ہیں اور ان کا یہ عمل اصلاح فی الارض کے زمرے میں آتا ہے۔اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِينَ إِلَّا مُبَشِّرِينَ وَمُنذِرِينَ فَمَنْ آمَنَ وَأَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ . (الانعام:۶/۴۸)	اور ہم رسولوں کو نہیں بھیجتے مگر مبشر اور منذر بنا کر، تو جو ایمان لائے اور انھوں نے اپنی اصلاح کرلی تو نہ ان کو کوئی خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

مختصر یہ کہ قرآن سے رہنمائی حاصل کرتے ہوئے اپنی زندگی کا رُخ صحیح کر لینا، فتنوں سے بچتے ہوئے یتیموں کے حقوق ادا کرنا، یتیموں کا سہارا بننے کے لیے ان کی ماؤں سے شادیاں کر لینا، ان کے ساتھ عدل کرنا اور یتیموں کی ان ماؤں کا نرم گرم ہر طرح کے حالات میں اپنے آپ کو ڈھال کر اپنے یتیم بچوں کی کفالت کا امکان پیدا کرنا، زن وشو کا

باہم خوشگوار تعلق رکھنا، شوہر کا بیوی کی عزت نفس کا خیال رکھنا، بیوی کا اپنے شوہر کی اطاعت کرنا، ان کی قوامیت کو تسلیم کرنا، وارثوں کو ان کا حق دینا، وصیت میں جانب داری سے گریز کرنا، جنسی بے راہ روی اور صنفی انارکی کو سماج سے ختم کرنا، عہد و میثاق کا پاس و لحاظ رکھنا، نفاق سے اجتناب کرنا، چوری اور ڈاکہ زنی سے دور رہنا، غلطی کرنے والا غلطی سے باز آجائے تو اسے معاف کر دینا اور اس کے لیے اپنا سینہ کھول دینا، غیر اللہ کی عبادت و اطاعت سے بچنا، ایمان دارانہ تجارت کو فروغ دینا اور بد دیانتی پر مبنی تجارت کی حوصلہ شکنی کرنا، خود بھی راہ راست پر رہنا اور ماتحتوں کی کارکردگی کی خلوص نیت سے نگرانی کرنا، ذمہ دار اعلیٰ کا ماتحت ذمہ داروں کو ان کے فرائض منصبی یاد دلاتے رہنا، تمسک بالکتاب اور اقامت صلوٰۃ کی تلقین کرنا، فیصلۂ خداوندی کے آگے سر تسلیم خم کر دینا، اخلاقی بیماریوں کو سماج سے دور کرنے کی کوشش کرنا، کج بحثیوں سے گریز کرنا، حسد اور لالچ سے بچنا، حق کو قبول کرنا اور اس کی طرف دوسروں کو دعوت دینا، یاس و قنوطیت سے بچنا اور ہر حالت میں اللہ سے امیدیں وابستہ رکھنا، بدکاری اور الزام تراشی سے بچنا، اپنی تگ و دو کا مرکز و محور آخرت کو بنانا، غلط رہنمائی سے احتراز کرنا، حد سے تجاوز نہ کرنا، اپنی غلطی کا احساس ہوتے ہی توبہ کر لینا اور ہمیشہ کے لیے اپنا رویہ درست کر لینا، قوم کے نوجوانوں پر خاص نظر رکھنا کہ وہ بگڑ نہ جائیں، قول و عمل میں مطابقت رکھنا، قرآن کو دستور حیات سمجھ کر زندگی کے تمام شعبوں میں اس سے رہنمائی حاصل کرنا، اللہ تعالیٰ سے عمل صالح کی توفیق کی دعا کرنا، انتشار و اختلاف سے بچنا، آپس میں نہ ٹکرانا، دو متصادم گروہوں کے درمیان صلح کرانے کی کوشش کرنا، ظالم کو راہ راست پر لانے کے لیے اس پر دباؤ ڈالنا، اجتماعیت کا تحفظ کرنا، کسی سے انتقام ہی لینا ہو تو اس کے ظلم سے زیادہ اس کو سزا نہ دینا اور حتی الامکان معاف کر دینا اور حق کا برملا اقرار و اعلان کرنا، یہ ساری صورتیں اصلاح فی الارض کی ہیں۔